راشد کی شاعری: بغاوت یا نمائندگی

خرم علیم

A piece of poetry as opposed to prose is often misrepresented as personal or autobiographical when written in the first person. Khurram Aleem, in this essay tries to analyse whether Rashed's poetry is an expression of rebellion by his person, or is it a collective representation of the ethos of his age and time.

ن م راشد کی شاعری کو بغاوت کی مثال قرار دیا گیا جس میں طے شدہ روایات، عشق کے افلاطونی تصور اور مذہبی اعتقادات سے نہ صرف انحراف کیا گیا بلکہ ان کو یکسر تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا گیا۔ اس سے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے انھوں نے ان تمام نظریات کے خلاف مزاحمتی ردِعمل کا اظہار بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ راشد کے نظریات مردم بیزاری سے شروع ہوتے ہیں اور مذہب بیزاری کی حدوں کو پار کرتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ راشد کے حوالے سے تعینات میں لپٹی ہوئی روایتی تنقید کو ہی آلہِ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ اسی لئے راشد کو ہمیشہ اس کے اپنے کہے ہوئے کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ کوئی بھی شاعر اپنے کہے کا خود ذمہ دار نہیں ہوتا، کیونکہ شاعر نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ شاعرانہ شخصیت اور شاعر کی ذاتی شخصیت میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ شاعرانہ ذہن ہمیشہ ان چیزوں اور نظریات کی نمائندگی کرتا ہے جو اس کے اپنے عہد، ماضی یا مستقبل کے متعلق ہوتے ہیں۔ شاعرانہ ذہن اور اسی شاعر کا فردی ذہن دو مختلف طریقِ کار سے کام کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر معاشرے کا اجتماعی ضمیر ہوتا ہے، شاعر کی تخلیقی

صلاحیتیں اس کی حساسیت کی بیضہ دانی میں نشو ونما پاتی ہیں اس لئے وہ اپنی عقل اور شعور کو ہمیشہ جذبے کے تابع رکھتا ہے۔ شاعرانہ عمل میں عقل (شعور) حساسیت اور نظریات ہمیشہ جذبات کی نگرانی اور سرپرستی میں اظہار کی سرحدوں تک پہنچتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی معاشرے میں عقل، شعور، فہم اور حساسیت کی کمی ہو، مگر جذبات کی کمی نہ ہو، جذبات ہر فرد کے اندر بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں، ہر فرد جبلی سطح پر جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ اس کے جذبات کی نشو ونما اور تربیت ہوئی ہے یا نہیں، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ ان تمام جذبات کو اپنے پورے وجود کے ساتھ محسوس کر رہا ہوتا ہے جن کو وہ بیان کی سطح تک نہیں لاسکتا۔ ایسے میں کسی شاعر یا ادیب کی عمومی ذمہ داری یہ ہوسکتی ہے کہ ان عمومی جذبوں کی نمائندگی اپنی تخلیقات میں کر دے (جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر شاعر ایسا کرتے ہیں اور سستی شہرت حاصل کرتے ہیں)۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شاعر اپنے تربیت یافتہ جذبات، غیر معمولی شعور اور حساسیت کی اعلیٰ ترین سطح کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسی تخلیقات کو جنم دے جو حقیقتاً کسی معاشرے کے تمام عمومی اور خصوصی نظامِ فکر اور نظامِ جذبات کی نمائندگی کرتی ہوں۔

میرے خیال میں راشد کی شاعری پر بغاوت کے جتنے بھی الزامات لگائے گئے وہ بے بنیاد ہیں۔ کیونکہ تنقید نگاروں نے بنیادی غلطی یہ کی کہ انھوں نے راشد کے کہے ہوئے کا ذمہ دار راشد کی ذات کو ہی قرار دیا۔ یہ واضح رہے کہ راشد کی بھی شاعرانہ شخصیت اور فردی شخصیت میں فرق ہے۔ راشد کی تمام بڑی تخلیقات اس کی شاعرانہ شخصیت اور شاعرانہ ذہن کی دین ہیں۔ اس سطح پر راشد ہمارے معاشرے کے مجموعی ماحول کی نمائندگی کر رہے تھے۔ راشد نے جو کچھ کہا وہ اپنی ذات سے نکل کر شاعرانہ ذات میں داخل ہونے کے باعث ممکن ہوا اس لیے اس سطح پر راشد معاشرے کی نمائندگی کر رہے ہیں نہ کہ محض اپنے ذاتی نظریات کی۔ جب افلاطون نے شاعروں سے ان کی تخلیقات کے بارے میں پوچھا کہ ان میں کیا کہا گیا ہے تو وہ عاجز آ گئے، کچھ نہ بتا پائے کہ ان کی تخلیقات کے کیا مفاہیم ہیں۔ اچھا ہوا کہ وہ اپنی ہی تخلیقات کی خود وضاحت کرنے نہیں بیٹھ رہے۔ وہ ایسا اس لیے نہیں کر پائے کہ شاعرانہ ذہن اور عام شخصی ذہن دو مختلف چیزیں ہیں اور

شاعر ان دونوں حالتوں کو مختلف اوقات میں بسر کر رہا ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ راشد ایک باغی شاعر ہے جس نے مذہب، فلسفہ، عشق، شاعرانہ روایت اور مشرقی رسوم ورواج سے بڑے بے باک انداز میں بغاوت کی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راشد کی بغاوت میں تعمیری عنصر کم ہیں اور تخریب کاری اور توڑ پھوڑ کا عمل نسبتاً زیادہ ہے۔ مشرقی کلاسیکی رسوم و رواج، رہن سہن اور نظریات سے بغاوت راشد کی شاعری کا نمایاں ترین پہلو ہیں۔ ایسی فرسودہ رسم ورواج کو راشد نے کھلے بندوں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

مذہب کے حوالے سے بھی راشد کی شاعری میں بغاوت موجود ہے۔ ناقدین نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طور اس قضیے کو حل کر سکیں لیکن آخر کار ایک ہی بات کہہ سکے کہ راشد باغی ہے اور فرد کی آزادی کا قائل ہے۔ فرد کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کا ہر فرد اپنی سوچ، آدرش، نظریات اور شعوری سطح پر آزاد ہو اور وہ اپنی زندگی انہی نظریات کی پیروی میں بسر کرے۔ یہاں راشد کی شاعری میں وجودی عناصر شامل ہوتے ہیں اور اس وجودیت پسندی میں راشد فرد کی آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ مگر یہ وجودیت بھی ادھوری ہے کیونکہ راشد برصغیر کے تمام انسانوں سے، بہت زیادہ مایوس تھے۔ ان کی نظم 'تعارف' اس حوالے سے خاصی اہم ہے:

اجل ان سے مل
کہ یہ سادہ دل
نہ اہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب
نہ اہلِ ادب اور نہ اہلِ حساب
نہ اہلِ کتاب
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشیں
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمیں
فقط بے یقیں

(تعارف)

اس نظم میں راشد انسانوں کا تعارف موت سے کروا رہے ہیں اور یہ پیغام دے رہے ہیں کہ یہ انسان حیوانیت کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں ان کی زندگی موت سے کہیں بہتر ہے۔ راشد اگرچہ ساری زندگی موت سے خوفزدہ رہے ہیں لیکن وہ موت کو ایک اعلیٰ چیز سمجھتے ہیں۔ اس لئے اعلیٰ وارفع کہ یہ زندگی کے دکھوں، جہالتوں اور بے شعوری کا خاتمہ کرتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ راشد کی شاعری میں زندگی سے خوف نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ زندگی سے فرار حاصل کرتے ہیں اور موت کی آغوش میں سو جانے کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ بظاہر دو متضاد چیزیں ہیں لیکن ذہنی طور پر بیمار آدمی زندگی سے بھی ڈرتا ہے اور موت سے بھی۔ وہ زندہ رہنا بھی چاہتا ہے لیکن اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے ذہن میں خودکشی کے منصوبے باندھتا رہتا ہے مگر ان منصوبوں میں کامیاب بھی نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ موت سے بھی اسے خوف ہے اور مرنے کے بعد کے 'مراحل' اسے موت سے بھی زیادہ خوفناک محسوس ہوتے ہیں۔ اس بیمار حالت میں وہ کبھی زندگی کی طرف بھاگتا ہے تو کبھی موت کی طرف۔ ان دونوں کو وہ گلے سے اس لئے نہیں لگا سکتا کہ اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو چکی ہے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں:

اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
(رقص)

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا تھا بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس

اس کے تختِ خاک کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
(خودکشی)

''کود جاؤں ساتویں منزل سے آج'' کہنے والا راشد اب دیکھئے ایک اور نظم میں انسانوں کو کیا درس دے رہا ہے:

زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو
آدمی تو تم بھی ہو آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
(زندگی سے ڈرتے ہو)

اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا یہ راشد کے نظریات کا تضاد ہے یا انسانی جبلت ہے یا وسیع تر سطح پر اس عہد کا فرد ان تمام کیفیات سے گزر رہا تھا؟ کیا یہ متضاد کیفیات اس نے خود پیدا کی تھیں؟ کیا وہ اپنی منفی قوتوں کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا؟ کیا وہ خیر و شر کے اس معرکہ میں شکست کھا کر حواس باختہ ہو چکا تھا؟ وہ زندگی سے محبت بھی رکھتا ہے اور مرنا بھی چاہتا ہے یا وہ زندگی سے شدید نفرت کرتا ہے اور اس کو بسر بھی نہیں کرنا چاہتا اور مر بھی نہیں سکتا:

عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں

اس لئے اب تھام لے

اے حسین اور اجنبی عورت مجھے اب تھام لے

(رقص)

کیا اس دور کے تہذیب یافتہ مہذب اور پڑھے لکھے انسان نے اپنے نفس کو اپنے قابو میں رکھنا نہیں سیکھا تھا۔ اس عہد کے شخص کو اپنے بارے میں یہ گمان تھا کہ وہ تمام اندھی جبلتوں سے اور حیوانیت سے مبرا ہو چکا ہے کیونکہ اس نے ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور فلسفیانہ سوچ میں بہت ترقی حاصل کر لی ہے اور اب اسے مذہب اور خدا کی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ وہ حقیقت پسند ہے اس لئے اوہام میں کیوں بھٹکتا پھرے:

نہیں، اس دریچے کے باہر تو جھانکو

خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے

اسی ساحرِ بے نشاں کا

جو مغرب کا آقا تھا مشرق کا آقا نہیں تھا

(پہلی کرن)

یاد رہے راشد نے یہ نظم ایک نیگرو نظم سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس دور کا فرد یہ سمجھتا تھا کہ مذہب اوہام کی آماجگاہ ہے، ہمیشہ کمزور اور ضعیف العقیدہ غیر مہذب اور بے شعور لوگ اس کو مانتے ہیں۔ تو اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ راشد اس عہد کے انسان کی کیفیات کو بیان کر رہا ہے یا اپنی ذاتی واردات کا اظہار کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ مہذب انسان پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بہت مجبور، بے بس اور لاچار ہو گیا تھا۔ اپنی تعلیم، تہذیب، شعور کی بالیدگی اور حقیقت پسندی پر اسے جتنا زعم تھا وہ خاک میں مل چکا تھا۔ اب وہ تنہا کھڑا تھا۔ نہ تو اس کے پاس مذہب کا سہارا تھا نہ معاشرتی رشتوں ناطوں کا اور اس کی خود ساختہ تہذیب اور حقیقت پسندی تو مٹی میں مل ہی چکی تھی۔ ایسے میں فکری اور ذہنی سطح پر یہ فرد در بدر پھرتا ہے۔ زندگی اسے پناہ نہیں دیتی اور موت اسے آغوش میں نہیں لیتی۔

اب یہی حقیقت پسندانہ اور مہذب شخص زندہ رہنے یا موت کو گلے لگا لینے کے ارادے باندھتا ہے اور توڑ دیتا ہے۔ اب اسے نہ زندگی حقیقت لگتی ہے نہ موت نہ مذہب نہ معاشرہ نہ تعلیم نہ تہذیب نہ شعور نہ آدرش بس لایعنیت کی دہلیز پر سسکتا ہوا کھڑا ہے۔ اب ہمیں یہ بھی جاننا ہے کہ راشد کی شاعری اس تمام پس منظر میں بغاوت ہے یا نمائندگی ہے۔ کیا اس کا ماحول اس کا خارج اس قدر پرسکون اور سہل تھا کہ وہ ذہنی اور جسمانی سطح پر پرسکون زندگی بسر کر سکتا۔

خارجی کیفیات پہلی اور دوسری جنگ عظیم انسانوں کی موت، معاشرتی رشتوں کی پامالی، ہوس، اندھی جبلت اور انسان کی بے وقعتی یہ ساری کیفیات راشد کے تخلیقی اور حساس ذہن کو لاحق تھیں۔ ایسے میں ایک عام فرد تو بغاوت کر سکتا ہے لیکن ایک بڑا تخلیق کار حالات کی سختیوں اور چیرہ دستیوں کو اپنے شعور اور تخلیق کی قوت بناتا ہے۔ وہ عام انسانوں کی طرح چیخ و پکار کر کے یا نعرے لگا کر یا خودکشی کر کے اظہار نہیں کرتا۔ بلکہ اس خارجی اور باطنی آسودگی کو اپنی تخلیقی قوت بناتا ہے اور اظہار کرتا ہے۔ اس دور میں خارجی صورتحال تمام انسانوں پر ایک جیسی تھی مگر ہر کوئی بیان کی سطح پر اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ راشد نے ایسا کیا ہے۔

میں اس عہد کے انسان کی زندگی کو فٹ بال کے ایک میدان سے تعبیر کرتا ہوں جس کا ایک پول زندگی کا تو دوسرا موت کا ہے۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس عہد میں زندگی کی یہ گیند زیادہ تر موت کے پول میں رہی۔ تو یہاں ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے کہ راشد کی شاعری میں زندگی اور موت کی یہ کشمکش اس عہد کی حقیقی صورتحال تھی جس کو اس نے بیان کیا ہے یا سراسر اس خارجی ماحول کی نمائندگی ہے۔ راشد کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راشد باغی نہیں بلکہ اپنے عہد کی خارجی و باطنی صورتحال کا نمائندہ ہے۔ اسی نمائندگی کی ایک آخری مثال دیکھیے:

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں

غریبوں جاہلوں، مُردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے

یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے

ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی۔۔۔
اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس، جو چیزیں ''ہماری'' ہیں
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

(انسان)